نقشِ
حیاتِ امام محمد تقیِ جوادؑ

ولادت: ۱۰ رجب ۱۹۵ھ
شہادت: ۲۹ ذی قعدہ ۲۲۰ھ

نقشِ زندگانی امام محمد تقی علیہ السلام

ماہ رجب ۱۹۵ھ کی دسویں تاریخ تھی جب امام رضاؑ کو پروردگار نے وہ فرزند عطا فرمایا جسے ان کے جملہ کمالات کا وارث اور ان کے منصب کا جانشین قرار دیا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک کے تقریباً ۴۰ سال گذر چکے تھے اور لوگ کبھی آپ کی امامت میں شک کرتے تھے کہ آپ کا کوئی فرزند نہیں ہے اور کبھی آپ کو طعنے دیتے تھے کہ رب العالمین نے آپ کو لاولد قرار دیا ہے یہاں تک کہ ایک شخص نے آپ کو خط لکھ دیا کہ آپ لاولد ہیں لہذا آپ کی امامت مشکوک ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ عنقریب مجھے پروردگار ایسا فرزند عنایت کرے گا جو میرا وارث ہوگا اور حق و باطل کے درمیان امتیاز قائم کرنے والا ہوگا۔ (اصول کافی)

واضح رہے کہ امام علی رضا علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں۔ ایک مامون رشید کی بیٹی تھی جس کا عقد باپ نے سیاسی مصالح کے تحت آپ سے کر دیا تھا اور ایک جناب سبیکہ تھیں جنھیں امام رضاؑ خیزران اور ریحانہ کے نام سے یاد فرمایا کرتے تھے اور جو جناب ماریہ قبطیہ کے خاندان سے تھیں اور ان کی کنیت ام الحسن تھی۔ لیکن یہ قدرت کا انتظام تھا کہ اس نے آپ کے وارث کو ایک عجم خاتون کے بطن سے پیدا کیا اور "سرکاری بیٹی" کو اس شرف سے محروم رکھا کہ اس طرح منصب الٰہی کی غلط تقسیم کا تصور نہ پیدا ہونے پائے اور یہ طریقۂ قدرت کا اس پہلے بھی رہا ہے کہ اس نے سیاسی اور مصلحتی شادیوں کو روا رکھا ہے لیکن ان رشتوں کو بار آور نہیں ہونے دیا کہ کسی طرح کی غلط فہمی کو رواج نہ دیا جا سکے۔

- آپ کی عمر مبارک ۳ یا ۴ سال کی تھی کہ امام رضاؑ نے بعض افراد کے جواب میں اس امر کی تصریح فرما دی تھی کہ یہ میرا فرزند میرے منصب کا وارث ہے اور یہی امام وقت ہے اور اس کی امامت پر تعجب کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خداوند عالم نے بچپنے ہی میں جناب یحییٰ کو نبی قرار دیا ہے،

اور یہ اس کی اپنی مصلحت ہے کہ کسی کے منصب کا اعلان گہوارہ میں کرادیتا ہے اور کسی کا اعلان ۴۰ سال تک روک لیا جاتا ہے۔ (اصول کافی)

خراسان آنے کے بعد بھی خیرانی کے والد کا بیان ہے کہ میں نے حضرت سے پوچھا کہ آپ کا وارث کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ابوجعفر۔ میں نے عرض کی کہ وہ تو ابھی کمسن ہیں؟ فرمایا کہ مالک کائنات نے اس سے زیادہ کم عمر میں جناب عیسیٰ کو نبی و صاحب کتاب اور صاحب شریعت بنادیا تھا، لہذا یہ کوئی حیرت انگیز امر نہیں ہے۔ (اصول کافی)

● آپ کی کنیت ابوجعفر الثانی تھی اس لیے کہ امام محمد باقرؑ کو بھی ابوجعفر کہا جاتا تھا، اور آپ کے مشہور القاب میں قانع، مرتضیٰ، نجیب، تقی اور جواد وغیرہ ہیں جن میں آخر الذکر کی شہرت خود کاظمین وغیرہ کے علاقہ میں زیادہ ہے اگرچہ لفظ تقی سے آپ کو ہمارے علاقوں میں بآسانی پہچان لیا جاتا ہے۔

● بادشاہانِ وقت میں وقت ولادت ہارون رشید کے فرزند امین کی حکومت چل رہی تھی ۱۹۸ھ میں اسے اس کے بھائی مامون نے قتل کرادیا تو وہ تخت نشین ہوگیا اور ۲۱۸ھ تک اس کا دور حکومت رہا۔ اس کے انتقال کے بعد معتصم عباسی خلیفہ ہوگیا اور اسی نے ۲۲۰ھ میں ۲۵ سال کی عمر میں آپ کو زہر دے کر شہید کرادیا۔

● امام رضاؑ کی شہادت ۲۰۳ھ میں ہوئی ہے لیکن آپ کو مدینہ سے دوسری صدی کے خاتمہ سے پہلے ہی طلب کرلیا گیا تھا، اور اس طرح آپ اپنے والد محترم کے سایہ عاطفت سے نہایت ہی کمسنی میں محروم ہوگئے اور پھر بظاہر دونوں میں ملاقات بھی نہیں ہوسکی یہاں تک کہ آپ خراسان باعجاز تجہیز و تکفین کے لیے تشریف لے آئے اور اس وقت بھی آپ کی عمر ۷-۸ برس سے زیادہ نہ تھی۔

● امام جوادؑ کی عمر تمام ائمہ طاہرینؑ میں سب سے کم رہی اور آپ نے دار دنیا میں صرف ۲۵ سال گذارے ہیں لیکن کمالات و فضائل اور نشر علوم و احکام میں کسی طرح کی کمی یا کوتاہی نہیں ہوئی اور ایک ایک جلسہ میں ۳۰ ہزار سوالات کے جوابات عنایت فرمادیے ہیں جس جلسہ کا سلسلہ تین روز تک مسلسل قائم رہا تھا۔

امام علی رضاؑ کو زہر دینے کے بعد اور سر دربار امامؑ کے اس اعلان کے بعد کہ جہاں تو نے بھیجا ہے وہاں جارہا ہوں۔ مامون کے سارے تلنے بانے ایک مرتبہ پھر بکھر گئے تھے کہ اب تک تو صرف عباسیوں کو شکایت تھی کہ ہمارے ہوتے ہوئے علویین میں ولی عہدی کیونکر چلی گئی اور اب علویین کو بھی شکایت پیدا ہوگئی کہ زہر ہی دینا تھا تو ولی عہدی کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی اور پھر سرکاری داماد بنانے کا کیا کام تھا چنانچہ اس طرح مامون ایک عجیب و غریب کشمکش میں مبتلا ہوگیا اور اسے تمام تر فکر اپنے مظالم کی پردہ پوشی کی ہوگئی۔ چنانچہ پہلا پروگرام یہ بنایا کہ امام محمد تقیؑ کو مدینہ سے دارالخلافہ بغداد طلب کرلیا جائے اور ان کی عظمت اور ان کے تقرب کا اعلان کردیا جائے تاکہ علویین میں یہ احساس پیدا ہوجائے کہ اگر اس نے باپ کو زہر دیا ہوتا تو بیٹے کے ساتھ اس طرح کا احترام کا برتاؤ نہ کرتا۔ چنانچہ آپ کو طلب کرلیا گیا اور آپ مدینہ سے بغداد پہونچ گئے۔ خدا برا کرے سیاست دنیا کا کہ یہ انسان کو طرح طرح کے حربے سکھاتی رہتی ہے اور عام طور سے ارباب اقتدار اپنے اقتدار کا زور دکھلانے کے لیے بڑی شخصیتوں کو دیر تک دربار میں اذن باریابی نہیں دیتے ہیں کہ اس طرح دربار کی عظمت کا اظہار ہوجائے گا اور ہر شخص کو معلوم ہوجائے گا کہ بادشاہ سلامت کے اذن کے بغیر کوئی دربار میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ امام محمد تقیؑ کو بھی کسی مقام پر ٹھہرا دیا گیا۔

اتفاق وقت کہ ایک دن بادشاہ کی سواری برآمد ہوئی اور آپ ایک راستہ میں کھڑے ہوئے بچوں کا کھیل دیکھ رہے تھے کہ کس طرح سماج کے بچے بے تربیت ہونے کی بنا پر اپنا وقت کھیل کود میں ضائع کررہے ہیں اور کس طرح سلاطین زمانہ امت کی تربیت و تعلیم کی طرف سے غافل ہوگئے ہیں۔ کہ اچانک بادشاہ کی سواری آگئی اور بچے بھاگ گئے کہ حکومت نے انھیں صرف شاہی آداب اور سلطنتی احترام کی تربیت دی تھی، کھیل کود کے بارے میں انھیں کوئی تربیت نہیں دی گئی تھی۔

امام جوادؑ کا طرز عمل بچوں سے بالکل مختلف رہا۔ جب وہ سب کھیل رہے تھے تو آپ دیکھ رہے تھے اور جب وہ سب بھاگ گئے تو آپ اپنی جگہ پر کھڑے رہے یہاں تک کہ سواری قریب آگئی اور بادشاہ نے اس جرأت پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا کہ تم نے راستہ کیوں نہیں چھوڑا!

آپ نے فرمایا کہ نہ راستہ تنگ تھا اور نہ میں گنہ گار تھا بھاگنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ صرف ایک ہی امکان تھا کہ تو ایسا ظالم ہو کہ بلا سبب بھی سزا دیتا ہو اور یہ میں نہیں کہہ سکتا ہوں۔ اس نے مزید حیرت کا اظہار کیا اور آگے بڑھ گیا۔ واپسی میں ایک مچھلی شکار کر کے لایا اور اسے مٹھی میں دبا کر آپ کا امتحان لیا کہ یہ کیا ہے؟ آپ نے نہایت تفصیل کے ساتھ مچھلی کی اصل تک بیان فرمادی کہ رب العالمین نے آسمان و زمین کے درمیان دریا پیدا کیے ہیں اور ان دریاؤں میں مچھلیاں پیدا کی ہیں اور سلاطین وقت کو شکار کا ذوق دیا ہے اور وہ اپنے بازوں کے ذریعہ ان مچھلیوں کا شکار کر کے خاندان نبوت کا امتحان لیا کرتے ہیں۔

مامون یہ سُن کر حیرت زدہ رہ گیا اور پوچھا کہ ذرا اپنا تعارف تو کرائیے۔ آپ نے فرمایا کہ میں محمد بن علی بن موسیٰ الرضاؑ ہوں۔ اس نے فوراً گلے سے لگا لیا اور اس طرح اپنے فضل و کمال کے سہارے دربار تک رسائی ہو گئی۔

مامون نے پہلے بھی آپ کے کمالات کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا اور اب تو معلومات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس نے دربار میں آتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ میں اپنی بیٹی ام الفضل کا عقد اس فرزند سے کرنے والا ہوں۔ عباسیوں میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی کہ کل علی رضاؑ کو داماد بنایا تھا اور اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور آج پھر دوبارہ یہ غلطی کی جا رہی ہے۔ لوگوں نے دبے الفاظ میں اعتراض بھی کیا۔ کہ ایسا ہی ارادہ ہے تو پہلے بچہ کی تربیت و تعلیم کا انتظام کیجیے اس کے بعد عقد کریں ورنہ بڑی بدنامی ہو گی کہ خلیفۃ المسلمین نے اپنی اچھی خاصی لڑکی کو ایک کمسن اور اَن پڑھ بچہ کے حوالے کر دیا ہے اور یہ بات حکومت کے حق میں انتہائی معیوب اور مضر ثابت ہو گی۔

مامون نے کہا کہ میں اپنا ارادہ تبدیل نہیں کر سکتا ہوں اور یہ بچہ اَن پڑھ نہیں ہے۔ اس کا نام محمد ہے اور یہ تمہارے علماء سے زیادہ علم رکھتا ہے، تمہیں یقین نہ ہو تو ابھی امتحان کر کے دیکھ لو تمہیں خود ہی اپنے علم و فضل کا اندازہ ہو جائے گا۔

لوگوں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر یحییٰ بن اکثم کو تلاش کیا جو اس دور کا قاضی القضاۃ اور سب سے بڑا عالم تھا کہ یہ امام محمد تقیؑ سے بحث کر کے ان کی علمی حقیقت کو آشکار کرے۔ یحییٰ نے وارد

ہوتے ہی سوال کی اجازت طلب کی اور اسلامی فقہ کا سب سے مشکل مسئلہ کفارات کا چھیڑ دیا کہ اگر کوئی شخص حالت احرام میں شکار کر لے تو اس کا کفارہ کیا ہو گا؟ آپ نے فرمایا کہ آپ کا سوال ناقص ہے، پہلے سوال کو مکمل کریں اس کے بعد جواب دیا جائے گا۔ اس نے کہا کہ سوال میں کیا نقص ہے؟ فرمایا کہ اس مسئلہ کی ۲۲ صورتیں ہیں:

۱۔ شکار حل میں تھا یعنی حدود حرم سے باہر یا حرم میں؟

۲۔ شکار کرنے والا مسئلے سے باخبر تھا یا جاہل؟

۳۔ عمداً شکار کیا ہے یا دھوکہ سے شکار ہو گیا ہے؟

۴۔ شکار کرنے والا آزاد تھا یا غلام؟

۵۔ بالغ تھا یا نابالغ؟

۶۔ پہلی مرتبہ شکار کیا تھا یا بار بار شکار کر چکا تھا؟

۷۔ شکار پرندہ تھا یا کوئی اور جانور؟

۸۔ چھوٹا تھا یا بڑا؟

۹۔ شکاری اپنے عمل پر نادم تھا یا مُصر؟

۱۰۔ شکار رات کے وقت کیا گیا ہے یا دن میں؟

۱۱۔ احرام حج کا تھا یا عمرہ کا؟

آپ نے ان میں سے کس صورت کے بارے میں سوال کیا ہے؟

یحییٰ مبہوت ہو کر رہ گیا اور مامون نے حضرت سے خطبۂ عقد پڑھنے کی خواہش کر دی۔ آپ نے خطبہ پڑھا اور ام الفضل سے آپ کا عقد ہو گیا۔ حکومت کی طرف سے تمام حاضرین کو انعامات تقسیم کیے گئے اور جلسہ تقریباً برخاست ہو گیا کہ ایک مرتبہ مامون نے کہا کہ فرزند رسولؐ! اب آپ مہربانی کر کے ان سوالات کے جوابات بھی عنایت فرما دیں تاکہ درباری افراد مستفید ہو سکیں۔

آپ نے فرمایا:

۱۔ اگر حالت احرام میں حدود حرم سے باہر شکار کیا ہے اور شکار پرندہ ہے اور بڑا بھی ہے تو کفارہ ایک بکری ہے۔

ب۔ اگر یہی شکار حدود حرم کے اندر ہوا ہے تو دو بکریاں۔

ج۔ اگر پرندہ چھوٹا تھا تو دنبہ کا بچہ جو ماں کا دودھ چھوڑ چکا ہو۔

د۔ اور اگر یہ شکار حرم میں ہوا ہے تو اس پرندہ کی قیمت اور ایک دنبہ۔

ہ۔ اگر شکار چوپایہ ہے تو اگر وحشی گدھا ہے تو کفارہ ایک گائے اور شتر مرغ ہے تو کفارہ ایک اونٹ اور ہرن ہے تو ایک بکری۔

و۔ اور یہی شکار حدود حرم میں ہوا ہے تو کفارہ دوگنا۔

ز۔ احرام عمرہ کا ہے تو کفارات کو خانہ کعبہ تک پہونچانا ہوگا اور قربانی مکہ میں ہوگی، اور اگر احرام حج کا ہے تو قربانی منیٰ میں ہوگی۔

ح۔ کفارات کے بارے میں واقف اور ناواقف میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سب کو کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔

ط۔ قصداً شکار کرنے میں کفارہ کے علاوہ گناہ بھی ہوگا، دھوکے کے شکار میں گناہ نہیں ہے۔

ی۔ آزاد کا کفارہ خود اس کے ذمہ ہوگا اور غلام کا کفارہ مالک کو ادا کرنا ہوگا کہ غلام خود بھی مالک کی ایک ملکیت ہی شمار ہوتا ہے، وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا ہے۔

ک۔ بالغ پر کفارہ واجب ہے نابالغ پر کسی طرح کا کفارہ نہیں ہے۔

ل۔ پشیمان انسان آخرت کے عذاب سے بچ جائے گا اور اصرار کرنے والے کو اس عذاب کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔

اس کے بعد مامون نے یحییٰ سے کہا کہ آپ کے سوالات کے جوابات تو ہوگئے اب ابوجعفر آپ سے سوال کریں گے اور آپ کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ یحییٰ جو اپنے ہی سوال کی تفصیل سے عاجز تھا وہ امام کے سوال کا جواب کیا دے گا لیکن "حکم حاکم مرگ مفاجات" کے طور پر تیار ہوگیا اور حضرت نے یہ سوال کر دیا کہ بتائیے وہ عورت کون سی ہے جو صبح کے وقت ایک مرد پر حرام تھی، دن چڑھے حلال ہوگئی۔ ظہر کے وقت پھر حرام ہوگئی عصر کے وقت پھر حلال ہوگئی۔ مغرب کے وقت پھر حرام ہوگئی عشاء کے وقت پھر حلال ہوگئی۔ آدھی رات کو پھر حرام ہوگئی۔ اور صبح کے وقت

پھر حلال ہوگئی۔

یحییٰ اس سوال کو سن کر بدحواس ہوگیا اور اپنی عاجزی کے اقرار پر مجبور ہوگیا اور آخرکار حضرت ہی سے جواب کا مطالبہ کر دیا۔

آپ نے فرمایا کہ یہ کسی شخص کی کنیز تھی جو غیر مالک کے لیے حرام تھی۔ پھر اس نے خرید لیا تو حلال ہوگئی۔ پھر آزاد کر دیا تو دوبارہ حرام ہوگئی، پھر عقد کر لیا تو دوبارہ حلال ہوگئی، پھر صیغۂ ظہار پڑھ کر اسے اپنی ماں جیسا کہہ دیا تو پھر حرام ہوگئی۔ پھر کفارہ دے دیا تو پھر حلال ہوگئی۔ اس کے بعد طلاق دے دی تو پھر حرام ہوگئی اور پھر رجوع کر لیا تو پھر حلال ہوگئی۔ اس طرح ایک ہی عورت ایک ہی مرد کے لیے چار مرتبہ حلال ہوئی اور چار مرتبہ حرام۔ اور یہ کوئی معمہ نہیں ہے یہ شریعت اسلام کا کھلا ہوا مسئلہ ہے جس کے ادراک کے لیے شریعت پر مکمل عبور درکار ہے جو شرف رب العالمین نے صرف خانوادۂ رسالت کو عنایت فرمایا ہے۔ (صواعق محرقہ، نور الابصار، شرح ارشاد وغیرہ)

عقد کے بعد حکومت کی طرف سے حاضرین کی حلوہ اور عطریات سے تواضع کی گئی اور محفل عقد برخاست ہوگئی۔ مامون کا دعویٰ صحیح ثابت ہوا اور عباسیوں کو ذلت آمیز شکست نصیب ہوئی کہ آل محمدؐ کسی تعلیم اور تربیت کے محتاج نہیں ہیں، یہ اپنے علوم و کمالات اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں اور کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ نہیں کرتے ہیں۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ام الفضل کو امام محمد تقیؑ کے گھر میں وہ سکون و آرام اور وہ سامان عیش و نشاط نہیں فراہم ہو سکتا تھا جس کی مامون کے گھر میں فراوانی تھی اور جس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی تھی۔ یہ بات ام الفضل پر بھی واضح تھی اور مامون کو بھی یہ معلوم تھا کہ جس بچہ کے باپ کو زہر دے کر شہید کرا چکا ہے اور جو کمسنی کی بنیاد پر کچھ کاروبار کرنے کے قابل بھی نہیں ہے، وہ مادی نقطۂ نظر سے یقیناً اپنی زوجہ کو وہ آرام نہیں پہونچا سکتا ہے جس کا ماحول اس کو اپنے والدین کے گھر میں حاصل تھا اور اس بنیاد پر مامون کو ایسا اقدام نہیں کرنا چاہیے تھا اور ام الفضل کو بھی بروقت انکار کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عقد برائے عقد ہو تو ان امور کا لحاظ کیا جاتا ہے اور جب عقد برائے سیاست ہو تو اس میں سن و سال یا مال و منال کی رعایت نہیں کی جاتی ہے۔ ایسے عقد میں تو صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس مصلحت کے تحت رشتہ کیا جا رہا ہے

اس مصلحت کا حصول ممکن ہے یا نہیں۔ باقی معاملات پر نظر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ مامون کی نظر میں سیاسی فائدہ یقینی الحصول تھا اور اسی بنیاد پر اس نے ام الفضل کو بھی راضی کر لیا تھا اور شاید یہ بھی سمجھا دیا ہو کہ تمھیں شوہر کے گھر نہیں رہنا ہے لہذا اس کے حالات سے کیا تعلق ہے۔ تمھارا باپ خلیفۃ المسلمین ہے اور تمھارے راحت و آرام کے لیے یہ خلافت ہی کافی ہے شوہر کے وسائل آمدنی پر نظر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن حالات بالکل برعکس ثابت ہوئے کہ چند روز کے بعد امام محمد تقیؑ مدینہ جانے اور ام الفضل کو ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس مقام پر یہ کہنا مشکل ہے کہ مامون نے کن حالات کی بنا پر آپ کو جانے کی رضا مندی دے دی اور اس نے اپنی بیٹی کی دل جوئی کے لیے جبراً آپ کو کیوں نہیں روکا جب کہ یہ بات اس کے اختیار میں تھی۔ شائد اس کی ایک مصلحت یہ بھی رہی کہ چند دنوں کے اندر امام محمد تقیؑ کے جس قدر کمالات سامنے آ چکے تھے وہ کسی وقت بھی مامون کے لیے خطرہ بن سکتے تھے اور لوگوں کی توجہ اس کی طرف سے ہٹ کر امام محمد تقی کی طرف ہو سکتی تھی لہذا اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ ان کو مدینہ کے لیے رخصت کر دیا جائے لیکن یہ بات ام الفضل کے مصالح اور اس کے مزاج کے بالکل برخلاف تھی لیکن "مرتا کیا نہ کرتا" بالآخر شوہر کی اطاعت ضروری تھی اور ابھی بغاوت کے اعلان کا مناسب وقت نہیں آیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی امام علیہ السلام کے ساتھ مدینہ جانے پر رضا مند ہو گئی اور حضرت ام الفضل کو لے کر مدینہ روانہ ہو گئے۔ مدینہ پہونچ کر غربت، پریشانی، سادگی اور تقدس کا ماحول اور پھر عیش و عشرت کے ماحول سے دوری جیسے سب مصائب تو ام الفضل کی جان کے لیے تھے ہی کہ اُدھر امام محمد تقیؑ نے نسل امامت کے قیام کی خاطر جناب سمانہ خاتون سے عقد کر لیا جو جناب عمار یاسر کے خاندان سے تھیں اور اس رشتہ سے ان کا سماجی احترام بھی مامون کی بیٹی سے کم نہ تھا۔ عقد ثانی کی خبر ام الفضل کے دل پر بجلی بن کر گری جو عام طور سے تمام عورتوں کا حال ہوتا ہے چہ جائیکہ خلیفۃ المسلمین کی بیٹی۔ اس کی موجودگی میں دوسری عورت کا آنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کا وجود شوہر کے لیے اطمینان بخش یا وجہ سکونِ حیات نہیں ہے اور یہ اس کی نظر میں اُس کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ چنانچہ اس نے فی الفور اپنے باپ کو اس حادثہ کی اطلاع دی، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ دو میں سے ایک رشتہ کو فی الفور ختم ہو جانا چاہیے۔ لیکن مامون ایسی کش مکش میں گرفتار تھا کہ اس کے امکان میں فی الفور کچھ نہ تھا، اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ جس چیز کو خدا نے حلال

کیا ہے میں اسے کس طرح حرام کر سکتا ہوں۔ اور شائد مامون کو ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ اگر اس مسئلہ میں امام محمد تقیؑ سے بازپُرس کی گئی تو ہو سکتا ہے کہ ان کی طرف سے خود میرے حرم کے بارے میں آواز اُٹھ جائے اور میں اس بھیڑ بھاڑ کی کوئی صفائی نہ دے سکوں جو ہر وقت میرے حرم میں لگی رہتی ہے۔ لہذا اس نے اس مسئلہ سے اعراض اور کنارہ کشی ہی کو مسئلہ کا بہترین حل قرار دیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مامون کی سیاست زوجیت کے مزاج سے بالکل مختلف شے تھی اور دنیا کا ہر مسئلہ سیاسی مصالح سے طے نہیں ہو سکتا ہے اس لیے ام الفضل اپنے مقام پر پریشان رہی اور وہ کسی طرح گلوخلاصی کے بارے میں سوچتی رہی۔

سنہ ۲۰۳ھ سے ۲۱۵ھ تک یہی صورت حال برقرار رہی اور ام الفضل باپ کو شکایت نامے لکھتی رہی لیکن مامون اس کا کوئی نوٹس نہ لے سکا۔ البتہ اس کے گھر والے دل ہی دل میں مچلتے رہے اور ان کی خواہش تھی کہ مامون کوئی ایکشن لے اور اپنی بیٹی کے مسئلہ کو بہانہ بنا کر امام محمد تقیؑ سے گلوخلاصی حاصل کر لے۔ لیکن مامون کے حالات کسی طرح قابو میں نہ آ سکے اور وہ کوئی نیا سیاسی قدم نہ اٹھا سکا۔ یہاں تک کہ سنہ ۲۱۸ھ میں اس کا انتقال ہو گیا اور خلافت اس کے بھائی معتصم کے ہاتھ میں آ گئی۔ ام الفضل کو اپنے چچا کا مزاج معلوم تھا اور اسے یہ توقع تھی کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی قدم ضرور اٹھائے گا۔ چنانچہ اس نے فوراً شکایت نامہ روانہ کر دیا۔ اور پھر شکایتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا یہاں تک کہ ایک سال کے بعد ہی معتصم نے آپ کو مدینہ سے بغداد طلب کر لیا اور آپ اس عالم میں اپنے وطن سے جُدا کیے گئے کہ نہ اپنی زوجہ محترمہ کو ساتھ لا سکے اور نہ اپنے فرزند امام علی نقیؑ کو۔!

بغداد آنے کے بعد آپ کو قید کر دیا گیا اور یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک قائم رہا یہاں تک کہ ۲۹ ذی قعدہ سنہ ۲۲۰ھ کو آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا جس کا اقرار اکثر مورخین و محدثین اسلام نے کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ابن حجر مکی در صواعق، ملا حسین واعظ کاشفی (روضۃ الشہداء) — ملا جامی (شواہد النبوۃ)، شبلنجی (نور الابصار)۔

امام محمد تقیؑ کی نظر میں ام الفضل کی یہ خیانت اس قدر شدید جرم کی حیثیت رکھتی تھی کہ آپ نے اس کے حق میں بد دعا فرمائی اور وہ ایک ایسے ناسور میں مبتلا ہو گئی کہ زندگی بھر لذتِ حیات

سے محروم رہی اور دنیا و آخرت دونوں میں خسارہ کی حقدار ہو گئی۔

آپ نے اپنی زندگی کے تقریباً ۸ سال امام رضاؑ کی زندگی میں گذارے اگرچہ باپ سے ان کی شہادت کے تین سال قبل ہی جُدا ہو چکے تھے۔ اس کے بعد سے آپ کے اپنے دور قیادت کا آغاز ہوا تو آپ نے مامون ہی کو برسر اقتدار دیکھا۔ اگرچہ اس سے پہلے باپ کے زیر سایہ رہ کران تمام حالات کو دیکھ چکے تھے جو عالم اسلام میں پیش آرہے تھے اور جہاں ۱۹۷ھ میں مامون نے امین کی حکومت کا تختہ الٹنے کا پروگرام بنالیا تھا اور سارے بغداد کا محاصرہ کرلیا تھا اور ایسی خوں ریز جنگ ہوئی تھی کہ بالآخر امین مارا گیا اور ۱۹۸ھ میں مامون باقاعدہ طور پر پورے عالم اسلام کا خلیفہ ہو گیا۔ اس وقت آپ کی عمر شریف صرف تین سال کی تھی لیکن اپنی خداداد صلاحیت کی بنا پر آپ نے باقاعدہ طور پر مامون کی ذہنیت اور اس کے مزاج کا جائزہ لے لیا کہ وہ اقتدار کی خاطر اپنے حقیقی بھائی کا خون بھی بہا سکتا ہے اور اس کی اس حکومت پر قبضہ کرسکتا ہے جو اس کے باپ نے خود اسے عنایت کی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے سفاک انسان سے بنی ہاشم اور علویین کے بارے میں کس نیک برتاؤ کی توقع کی جاسکتی ہے اور اس کے بارے میں کس شرافت کا تصور کیا جاسکتا ہے ۔۔۔ اور اسی بنا پر امام محمد تقیؑ کو نہ اس دامادی سے کوئی مسرت ہوئی اور نہ اس درباری تقرب سے۔ خصوصیت کے ساتھ جب آپ نے یہ دیکھ لیا کہ دامادی کے ساتھ ولی عہدی کا مرتبہ دینے کے بعد بھی مامون نے پدر بزرگوار کو زہر دے کر شہید کرادیا ہے۔ اس کے باوجود آپ اپنے فرائض منصبی کی طرف باقاعدہ طور پر متوجہ رہے اور مصائب کے خوف سے ترویج شریعت کا کام نظرانداز نہیں کیا۔ چنانچہ امام رضاؑ کی شہادت کی خبر پانے کے بعد ہی آپ مسجد پیغمبرؐ میں منبر پر تشریف لے گئے اور یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

"ایہا الناس! میں محمدؐ بن علیؑ رضا ہوں، میں جواد ہوں، اور صلب پدر میں لوگوں کے نسب کا جاننے والا ہوں اور تمھارے ظاہر و باطن سے آگاہ ہوں، میں تمام مخلوقات کے حالات کو خلقت کے قبل سے آسمان و زمین کے فنا ہونے کے بعد تک بخوبی جانتا ہوں۔ لیکن افسوس کہ اپنے بزرگوں کی طرح ان حالات کا اظہار نہیں کرسکتا۔" (بحارالانوار)

امام علیہ السلام نے اس خطبہ میں جن نکات کی طرف توجہ دلائی ہے، ان پر انتہائی دقتِ نظر کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ نے اپنے کمالات میں اپنے جود و کرم کا حوالہ دیا ہے اور پھر لوگوں کے نسب سے واقفیت کا ذکر کیا ہے۔ خدا جانے کہ اس علم الانساب سے کس نکتہ کی طرف توجہ دلانا چاہتے تھے اور اپنے جود و کرم کا تذکرہ کیوں ضروری خیال فرمایا تھا۔ کاش خطبہ کا پورا پس منظر نگاہوں کے سامنے ہوتا تو ان فقرات کی بلاغت کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا تھا اور ان کی روشنی میں ظالموں کے قدیم و جدید حالات کا پتہ لگایا جاسکتا تھا۔

امام محمد تقیؑ کو بغداد طلب کیا گیا تو آپ نے اپنی روانگی سے پہلے امام علی نقیؑ کی جانشینی کا اعلان کردیا جیسا کہ اسماعیل بن مہران کی روایت میں ہے کہ جب حضرت پہلی مرتبہ بغداد جارہے تھے تو میں نے پوچھا کہ خدانخواستہ اگر کوئی حادثہ پیش آگیا تو امت کا وارث کون ہوگا؟ تو آپ نے مسکرا کر فرمایا کہ مطمئن رہو میں واپس آؤں گا۔ لیکن جب دوسری مرتبہ معتصم کے بلانے پر تشریف لے گئے، تو فرمایا کہ اب اس خطرہ کا وقت آگیا ہے اور یہ کہہ کر گریہ فرمایا، اور فرمایا کہ میرا وارث میرے بعد میرا فرزند علیؑ ہوگا۔ (اصول کافی)

واضح رہے کہ اسماعیل بن مہران ایک مرد معتبر ہیں جو ابان بن جناح، ابوجمیلہ، مفضل بن صالح، احمد بن محمد، علی بن ابی حمزہ، محمد بن سلیمان اور محمد بن منصور الخزاعی وغیرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے روایت کرنے والے افراد میں ابو زکریا، ابوالحسین الرازی، الحسن بن خرداد اور الحسن بن موسیٰ وغیرہ جیسے افراد ہیں۔

شہادت

یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ امام کی شہادت زہر دغا سے ہوئی ہے اور یہ بات بھی مسلمات میں ہے کہ آپ کو زہر معتصم نے دلوایا ہے۔ اب اس امر میں بعض حضرات نے تشکیک کردی ہے کہ ذریعہ خود ام الفضل کو قرار دیا گیا تھا یا کسی دوسرے وزیر کو جیسا کہ بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ اس نے دعوت میں بلا کر زہر دے دیا تھا۔ بہرحال امام مظلومیت کی زندگی گذار کر اپنے مالک حقیقی کی بارگاہ میں پہونچ گئے لیکن زہر دینے کا فوری محرک یہ واقعہ ہوا کہ ایک چور کی سزا کے بارے میں قاضی شہر نے کلائی سے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا کہ یہی حصہ وضو میں دھویا جاتا ہے لیکن

جب آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ فیصلہ غلط ہے۔ ہتھیلی اعضاء سجدہ میں ہے اور اعضائے سجدہ اللہ کے لیے ہیں انھیں قطع نہیں کیا جا سکتا ہے؛ لہٰذا صرف انگلیاں کاٹ دی جائیں۔ جس فیصلہ کو بروقت تو معتصم نے پسند کر لیا لیکن بعد میں گھر جا کر قاضی نے فریاد کی کہ اس طرح سرکاری ملّا کا وقار ختم ہو جائے گا اور ان کی امامت کا عقیدہ مضبوط ہو جائے گا جو حضور کی حکومت کے لیے ایک سنگین خطرہ ہے جس شکایت کو سُن کر معتصم کو غصہ آگیا اور تین روز کے بعد ہی آپ کو زہر سے شہید کرا دیا۔

(جلاء العیون)

آپ کی تاریخ شہادت آخر ذی قعدہ ۲۲۰ھ ہے اور مقام دفن وہ جگہ ہے جسے کاظمین کہا جاتا ہے اور جہاں آپ کے جد بزرگوار امام موسیٰ کاظمؑ کی بھی قبر ہے۔ تجہیز و تکفین کے امور امام علی نقیؑ نے باعجاز آکر انجام دیے جو ہر امام کے غسل و کفن کا طریقہ رہا ہے اگرچہ ظاہری طور پر نماز جنازہ واثق بن معتصم نے بھی ادا کی تھی۔

ازواج و اولاد

گذشتہ بیانات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ امامؑ کی ازواج دو تھیں۔ جناب سمانہ مغربیہ جو امام علی نقیؑ کی والدہ گرامی تھیں اور ام الفضل جو مامون رشید کی بیٹی تھی اور اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی ہے۔

اولاد کی تعداد چار بتائی جاتی ہے دو پسر اور دو دختر۔ فرزندوں میں امام علی نقیؑ اور جناب موسیٰ مبرقع، اور دختران میں جناب فاطمہ اور امامہ۔

موسیٰ مبرقع ہی وہ بزرگ ہیں جن سے رضوی سادات کا سلسلۂ نسب ملتا ہے۔ اگرچہ یہ تمام حضرات قانونی اعتبار سے تقوی یا جوادی ہیں اس لیے کہ قانون نسب یہ قرار دیا گیا ہے کہ جہاں سے امام کی نسل غیر امام کی طرف منتقل ہوتی ہے وہیں سے نسبت طے کر دی جاتی ہے اور امام رضاؑ کی اولاد کا تعلق غیر امام سے نہیں ہے بلکہ آپ کے تنہا فرزند امام محمد تقیؑ ہیں اور سلسلۂ نسب ان کے بعد غیر امام یعنی موسیٰ مبرقع کی طرف منتقل ہوتا ہے، لہٰذا ان سادات کرام کو اصطلاحی طور پر تقوی سادات ہونا چاہیے لیکن امام رضاؑ کی دنیاوی وجاہت یا ان کے الگ سلسلۂ نسب کے نہ ہونے کی بنا پر سلسلہ انھیں

کی طرف منسوب کر دیا گیا اور سب رضوی سادات کہے جانے لگے جن کی تعداد غالباً ان تمام سادات سے زیادہ ہے جن کا سلسلہ کسی بھی دوسرے امام سے مختلف اولاد کے ذریعہ ملتا ہے۔

جناب موسیٰ مبرقع کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ آپ اس قدر حسین یا مقدس تھے کہ چہرہ پر نقاب ڈال کر گھر سے نکلا کرتے تھے اور اسی بنیاد پر آپ کو مبرقع کہا جاتا تھا۔ آپ کا سلسلہ آپ کے فرزند جناب سید احمد سے بڑھا ہے اور سید احمد کی نسل محمد اعرج سے آگے بڑھی ہے جیسا کہ اکثر علماء انساب نے تحریر کیا ہے۔

جناب موسیٰ مبرقع ہی نے اپنے والد بزرگوار کے حوالے سے پیغمبر اسلامؐ کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ ڈاڑھی کا مونڈنا مُثلہ کرنا ہے اور مُثلہ کرنے والے پر خدا کی لعنت ہوتی ہے۔ (مستدرک الوسائل)

لہٰذا کم از کم رضوی اور تقوی سادات کے لیے تو ڈاڑھی کا منڈانا قطعاً مناسب نہیں ہے کہ یہ شرعی جُرم ہونے کے علاوہ ناخلف اولاد ہونے کی بھی علامت ہے۔ خدا جملہ اولاد معصومینؑ کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق کرامت فرمائے۔

واضح رہے کہ امام محمد تقیؑ کی ایک صاحبزادی حکیمہ نام کی بھی تھیں جن کی قبر سامرہ میں ائمہ طاہرینؑ کی قبر کے ساتھ ہے اور انھوں نے چار اماموں کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے بلکہ امام زمانہؑ کی ولادت کے امور بھی انجام دیے ہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ علماء نے امام جوادؑ کی اولاد میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے اور سامرہ میں بھی ان کی مستقل زیارت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ہے جس پر علامہ مجلسی اور بحر العلومؒ نے بھی اظہار تعجب فرمایا ہے۔

کرامات

محمد بن علی الہاشمی کا بیان ہے کہ میں ام الفضل سے عقد کے دوسرے دن حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے بعض دواؤں کے استعمال کی بنا پر شدید پیاس لگی ہوئی تھی لیکن میں ان کے یہاں کا پانی نہیں پینا چاہتا تھا کہ آپ نے میرے مطالبہ کے بغیر پانی طلب کیا اور تھوڑا سا خود نوش فرما کر باقی مجھے عنایت فرما دیا جس کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ شیعوں کے امام واقعاً لوگوں کے اسرار

درموز سے باخبر ہوتے ہیں۔ (اصول کافی)

اس واقعہ سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ محبان آل محمدؐ کے گھر پانی نہ پینے کا سلسلہ نیا نہیں ہے بلکہ اس کا پروپیگنڈہ مامون رشید کے دور سے چلا آرہا ہے اور جب اس سے خود آل محمدؐ محفوظ نہیں رہ سکے تو چاہنے والے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں۔

● محمد بن ریان کہتے ہیں کہ مامون نے امام جوادؑ کو آزمانے کے لیے دو سو حسین وجمیل لونڈیاں آپ کے پاس بھیج دیں اور انھیں حضرت کو لبھانے پر مامور کردیا لیکن کردار امامت کی بلندی تھی کہ آپ نے کوئی توجہ نہیں فرمائی تو دربار میں بلاکر رقص و رنگ شروع کرادیا جس پر آپ نے گوّیے سے کہا کہ اے شیخ! خدا سے ڈر۔ اتنی لمبی ڈاڑھی اور یہ کاروبار۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساز اس کے ہاتھ سے گر گیا اور ہاتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شل ہوگیا۔ (اصول کافی)

● ایک شخص نے آپ سے آکر بیان کیا کہ ام الحسن نے آپ کا پرانا لباس طلب کیا ہے تاکہ کفن میں بطور تبرک رکھے تو آپ نے فرمایا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وطن واپس آیا تو معلوم ہوا کہ اس خاتون کا پندرہ دن پہلے انتقال ہوچکا ہے۔

● ایک شخص نے حضرت سے سفر کے بارے میں مشورہ کیا تو آپ نے منع فرمادیا۔ وہ رُک گیا لیکن اس کے ساتھی حماد بن عیسیٰ نے کہا کہ میں مکمل تیاری کرچکا ہوں۔ میں سفر ملتوی نہیں کرسکتا۔ چنانچہ وہ سفر پر روانہ ہوگیا اور راستہ میں ایک وادی میں قیام کیا جہاں ایسا سیلاب آیا کہ اس میں مع سامان کے بہہ گیا۔ (شواہد النبوۃ)

● معمر بن خلاد کا بیان ہے کہ مجھے ساتھ لے کر ایک وادی تک تشریف لے گئے اور وہاں مجھے روک کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے تو چہرہ اُداس تھا۔ میں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ میں طوس سے آرہا ہوں۔ میرے والد بزرگوار کا انتقال ہوگیا ہے اور میں ان کی نماز جنازہ کے لیے گیا تھا۔

● قاسم بن عبدالرحمان کا بیان ہے کہ میں زیدی المذہب تھا اور حضرت کی تعریف سُن کر حیران تھا اور ملاقات کا مشتاق تھا کہ ایک مرتبہ آپ کا اس طرف سے گذر ہوگیا۔ میں نے دیکھ کر کہا کہ کس قدر احمق ہیں وہ لوگ جو اس بچہ کو اپنا امام مانتے ہیں۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آواز آئی قاسم بن عبدالرحمٰن! جو ہماری اطاعت سے انحراف کرے گا وہ جہنم کا حقدار ہوگا۔ میں حیرت میں پڑ گیا اور سوچا کہ شاید

انھیں جادو وغیرہ میں کوئی دخل ہے کہ دوبارہ آواز آئی۔ تمھارا خیال غلط ہے۔ اپنے عقیدہ کی اصلاح کرو۔ یہ سُننا تھا کہ قاسم بے چین ہوگیا اور فوراً خدمت اقدس میں حاضر ہوکر آپ کی امامت کا اقرار کرلیا۔

اعترافات

● آپ صغیر السن تھے لیکن قدر و منزلت کے اعتبار سے کبیر اور ذکر خیر کے اعتبار سے بلند ترین درجہ پر فائز تھے ـــــــ محمد بن طلحہ شافعی (مطالب السئول)

● آپ کی منزلت نہایت درجہ بلند تھی ـــــــ ملاحسین واعظ کاشفی (روضۃ الشہدا)

● کمال علم و فضل میں امام جوادؑ تک بڑے بڑے صاحبان علم و کمال بھی نہیں پہونچ سکتے تھے۔
ـــــــ علامہ خاوندشاہ (روضۃ الصفا)

● آپ کے فضائل و مناقب بے شمار تھے اگرچہ آپ خود کمسن تھے ـ شبلنجی (نور الابصار)

● آپ نے ایک نشست میں تیس ہزار سوالات کے جوابات عنایت فرمائے ہیں اور اکثر سوالات کے وارد ہونے سے پہلے ہی جواب دے دیے ہیں ـــــــ علی بن ابراہیم (کافی)

اقوال حکیمانہ

● "خدائے متعال پر اعتماد رکھنا ہی ہر قیمتی شے کی قیمت اور ہر بلندی کا ذریعہ ہے۔"
(حقیقت امر یہ ہے کہ خدائے کریم پر اعتماد سے بڑی کوئی دولت اور انسانی نفس کے اطمینان کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ہر دولت فنا ہونے والی ہے لیکن یہ دولت فنا ہونے والی نہیں ہے۔ اور دور حاضر میں اعتماد علی اللہ نہ ہونے ہی کا نتیجہ ہے کہ عوام اور حکام سب حیران و سرگرداں نظر آرہے ہیں)۔

● "مومن کی عزت لوگوں سے بے نیازی میں ہے۔"
(انسان فاقوں میں گزار دے تو لوگوں کی نظر میں احترام رہ جاتا ہے لیکن ہاتھ پھیلائے تو وہ احترام بہرحال ختم ہوجاتا ہے چاہے مرغ مسلم ہی کیوں نہ نصیب ہوجائے)۔

● "ظاہر میں خدا کے دوست اور باطن میں اس کے دشمن نہ بنو۔"

دورِحاضر میں عالمِ اسلام کی اکثریت اسی عالم میں ہے کہ کلمہ پڑھ کر سب اللہ کے دوست بن گئے ہیں۔ لیکن اپنے اعمال اور کردار کے اعتبار سے بالکل دشمن خدا ہیں، اور وہی سب منکرات انجام دے رہے ہیں جو دشمنانِ اسلام انجام دے رہے ہیں جو دشمنانِ خدا انجام دے رہے ہیں، ایسی صورت میں دعوائے محبت کا کیا فائدہ ہے ؟)۔

● "جس نے خدا کی راہ میں ایک دوست حاصل کر لیا گویا جنت میں ایک گھر حاصل کر لیا۔"

(دنیا داری اور لہو و لعب کے لیے دوستوں کا پیدا کر لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن راہِ خدا پر چلنے کے لیے اور دین خدا کی خدمت کے لیے ساتھی پیدا کر لینا بہت مشکل ہے — انسان کے لیے جنت کے حصول کا سب سے اہم ترین ذریعہ یہی ہے کہ برادرانِ دینی میں اضافہ کرے اور لوگوں کو اس برادری میں داخل کرے)۔

● "بھلا وہ کس طرح ضائع ہو سکتا ہے جس کا ذمہ دار خدا ہو، اور وہ کس طرح بچ کر جا سکتا ہے جس کا طلب گار خدا ہو۔ جو غیر خدا کا ہو جائے گا خدا اسے اسی کے حوالے کر دے گا اور جو بغیر علم کے عمل کرے گا اس کا فساد اصلاح سے کہیں زیادہ ہوگا۔"

(اس کلام کے چاروں جملے قابلِ توجہ ہیں۔ انسان خدا پر اعتماد کر لے تو اس کے ضائع ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے کہ خدا جس کی ذمہ داری لے لے گا وہ کس طرح تباہ و برباد ہو سکتا ہے — اور انسان یہ یقین کر لے کہ خدا سے بچ کر نہیں جا سکتا ہے تو اس کا کردار خود بخود سنور جائے گا۔ خدا کو چھوڑ کر غیر کی طرف جانے میں سب سے بڑا خطرہ یہی ہے کہ خدا اس کے حوالے کر دے گا تو پھر کوئی کام آنے والا نہ ہوگا اور بلا علم کے عمل کرنے میں فساد کا خطرہ زیادہ رہتا ہے کہ انسان واقعی مسائل سے باخبر نہیں ہے تو لوگوں کو حلال کے بجائے حرام کی تعلیم دے سکتا ہے اور انھیں محرمات کے بجائے واجبات سے بھی روک سکتا ہے)۔

● "غلط آدمی کی صحبت سے پرہیز کرو کہ اس کی مثال شمشیرِ برہنہ کی ہے کہ دیکھنے میں بہت چمک دار معلوم ہوتی ہے لیکن انجام بہت بُرا ہوتا ہے۔"

(ساتھی اور رفیق بنانے سے پہلے کردار کا جائزہ لے لینا انتہائی ضروری ہے ورنہ انسان فاسق و فاجر کی رفاقت اختیار کرے گا تو وہ ظاہری اعتبار سے تو انتہائی مخلص یا گرمیٔ محفل کا سبب

بن جائے گا لیکن اس کا شر و فساد کسی وقت بھی نقصان پہونچا سکتا ہے)۔

● "خائن افراد کا امین ہونا خود بھی خیانت کار ہونے کے لیے کافی ہے۔"

(نیک صفت اختیار کرنے کے لیے اس کے محل اور موقع کا پہچاننا انتہائی ضروری ہوتا ہے ورنہ خیانت کار کی امانت داری میں خیانت کے علاوہ اور کیا ہاتھ آئے گا)۔

● "ہر مومن کو تین چیزوں کی ضرورت ہے: (۱) خدا کی توفیق (۲) اپنے نفس کی طرف سے موعظت (۳) دوسرے کی نصیحت کی قبولیت۔"

(جس انسان کو خدا کی توفیق حاصل نہ ہو اور اس کا ضمیر خود اسے نصیحت نہ کر سکتا ہو اور دوسروں کی نصیحت قبول کرنے کو بھی عار تصور کرتا ہو، وہ کسی اعتبار سے صاحب ایمان نہیں کہا جا سکتا ہے)۔

● "دل سے خدا کا قصد کرنا اعمال میں بدن کو تکلیف دینے سے زیادہ بہتر ہے۔"

(اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان سارے اعمال کو ترک کر کے خالی ذکر و فکر میں لگ جائے کہ یہ درحقیقت خدا کا تصور نہیں ہے بلکہ شیطان رجیم کا قصد اور اسی کا راستہ ہے۔ روایت کا صحیح ترین مفہوم یہی ہے کہ انسان صرف ظاہری اعمال پر بھروسہ نہ کرے اور توجہ قلب کی کوشش کرے کہ سارے اعمال کی روح اور جان یہی توجہ قلب ہے اور اس کے بغیر صرف بدن کے تھکانے اور اعضاء و جوارح کو حرکت دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے)۔

● "جس نے خواہشات کا اتباع کیا اس نے دشمن کی تمنا پوری کر دی۔"

(انسان کا بدترین دشمن شیطان رجیم ہے اور اس کا بہترین پیغام خواہشات کا اتباع ہے کہ اس کے پاس گمراہ کرنے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ لہٰذا جس شخص نے بھی شریعت کے بجائے خواہشات اور جذبات کا راستہ اختیار کر لیا اس نے گویا شیطان کی آرزو پوری کر دی اور اس کے راستہ پر چلا گیا)۔

● "ظلم بادشاہوں کے دورِ اقتدار کی آخری میعاد ہے۔"

(حقیقت امر یہ ہے کہ کوئی بھی حکومت کفر و الحاد کے ساتھ تو چل سکتی ہے لیکن ظلم و ستم کے ساتھ نہیں چل سکتی ہے۔ اور جب کسی حکومت میں ظلم داخل ہوتا ہے اور حکام رعایا پر ظلم کرنا

شروع کر دیتے ہیں تو رعایا میں بغاوت کا جذبہ شروع ہو جاتا ہے اور یہیں سے حکومت کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگتی ہیں اور ایک دن اسے عوامی انتقام کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے بعد خاتمۂ اقتدار کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ جاتا ہے)۔

● "صبر پر تکیہ کرو، فقر کو گلے لگاؤ، خواہشات کو چھوڑ دو، ہوا و ہوس کی مخالفت کرو، اور یہ خیال رکھو کہ تم خدا کی نگاہوں سے غائب نہیں ہو سکتے ہو، تو اب فیصلہ کرو کہ اس کے سامنے کیسا رہنا چاہتے ہو۔؟"

(امام علیہ السلام کے پورے ارشاد کا آخری فقرہ ہی انسان کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دینے کے لیے کافی ہے کہ اگر انسان کو واقعاً یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ ہر وقت رب العالمین کی نگاہوں کے سامنے ہے اور صرف خدا کو حاضر و ناظر کہتا ہی نہیں ہے بلکہ اسے حاضر و ناظر سمجھتا بھی ہے تو اس کے سارے اعمال اور کردار کی اصلاح ہو سکتی ہے)۔

"اگر کوئی شخص کسی معاملہ میں حاضر رہا اور اسے ناپسند کیا تو گویا حاضر نہیں تھا اور اگر کسی کام سے غائب رہا اور اسے پسند کیا تو گویا اس میں حاضر رہا۔"

(اس ارشاد کے دونوں حصے قابلِ توجہ ہیں کہ جو لوگ بُرائیوں کے مراکز یا اجتماعات میں مجبوراً موجود رہتے ہیں اور اپنی ناگواری کا اظہار کرتے رہتے ہیں وہ موجودگی کے مجرم نہیں ہیں لیکن جو لوگ غائب رہ کر بھی حسرتِ گناہ رکھتے ہیں وہ گویا اس گناہ میں شریک اور اس عملِ بد کے مجرم ہیں چاہے واقعاً عمل میں شریک نہ ہوں)۔

"تحفظ بقدرِ خوف ہوا کرتا ہے۔"

(اگر کوئی انسان گناہوں سے پرہیز نہیں کرتا ہے تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کے دل میں خوفِ خدا نہیں ہے ورنہ انسان کو جس قدر خوف ہوتا ہے اسی اعتبار سے اپنے بچاؤ کا انتظام کرتا ہے۔ گناہوں سے بچاؤ کا انتظام نہ کرنا اور خوفِ خدا کا دعویٰ کرنا ایک دوسرا گناہ ہے کہ انسان غلط بیانی سے بھی کام لے رہا ہے)۔

● "خواہشات کا ارتکاب کرنے والا لغزشوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا ہے۔"

(انسان کے لیے لغزشوں سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ خواہشات کو کنٹرول میں رکھے

اور اس سے اپنے نفس کو محفوظ رکھے ورنہ اپنے کو خواہشات کے حوالے کر دینے میں لغزش کے علاوہ کچھ ہاتھ آنے والا نہیں ہے)۔

● "جب قضا آجاتی ہے تو فضا تنگ ہو جاتی ہے۔"

(انسان کو یہ احساس بہرحال ہونا چاہیے کہ وہ کسی بھی قیمت پر دستِ قضا سے بچ کر نہیں جا سکتا ہے۔ وسیع ترین آفاق میں سیر کرنے والا بھی ایک دن دستِ اجل کا شکار ہو جاتا ہے لہٰذا انسان کو ہر وقت موت کا خیال رکھنا چاہیے اور موت کے بعد کی منزلوں کے لیے تیار رہنا چاہیے)۔

● "جو ظلم پر راضی ہو جائے اس کی ناراضگی میں کوئی نقصان نہیں ہے۔"

(انسان مخلوقات کی مرضی کا خیال کرنے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ یہ شخص کس بات پر راضی ہوتا ہے اور کس بات سے ناراض ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص ظلم و ستم ہی سے راضی ہوتا ہے تو اس کی ناراضگی کی ہرگز پرواہ نہ کرے بلکہ اس بات پر خوش ہو کہ میرا جادہ عدل و انصاف کا ہے اور اسی لیے ظلم پرور مجھ سے ناراض ہیں اور ناخوش ہیں۔ کاش! بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں اسلامی حکام کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہو جاتا اور وہ انھیں راضی کرنے کے بجائے رب العالمین کو راضی کرنے کی فکر کرتے کہ حکام جور و ستم صرف جور و ستم ہی سے راضی ہوتے ہیں، ان کی نگاہ میں عدل و انصاف کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے۔

نقشِ انگشتر

"نعم القادر اللّٰہ"

اصحاب اور تلامذہ

۱۔ ابو جعفر احمد بن محمد بن ابی نصر بزنطی، کوفی

امام رضا علیہ السلام کے اصحاب میں تھے اور امام محمد تقیؑ کے مخصوص شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی وثاقت کا یہ عالم تھا کہ جو روایت ان سے نقل کر دی جاتی تھی اس کا سلسلۂ سند نہیں دیکھا جاتا تھا بلکہ اسے صحیح تسلیم کر لیا جاتا تھا کہ انھوں نے کسی غیر معتبر راوی سے کوئی روایت نقل ہی نہیں کی ہے، انھوں نے ۲۲۱ھ میں وفات پائی ہے۔

۲۔ ابو محمد فضل بن شاذان بن خلیل ازدی نیشاپوری

۱۸۰ کتابوں کے مصنف اور انتہائی معتبر انسان تھے۔ امام عسکریؑ نے ان کے حق میں دو یا تین مرتبہ دعائے رحمت فرمائی ہے۔ محمد بن ابی عمیر اور صفوان بن یحییٰ وغیرہ جیسے جلیل القدر حضرات کے ساتھ برسوں زندگی گذاری ہے اور ان کے بعد قوم میں ایک مرجع روایات کی حیثیت رکھتے تھے۔

۳۔ ابو تمّام حبیب بن اوس الطائیؒ

اپنے دور کے بہترین شاعر تھے۔ ایک قصیدہ میں امام جوادؑ تک تمام ائمہ کا ذکر کیا ہے کہ ان کا انتقال امام جوادؑ ہی کے دور میں ہوگیا تھا اور جاحظ نے ان کا شمار رؤسا رافضہ میں کیا ہے جو ان کے شیعہ ہونے کی بہترین دلیل ہے۔

ان کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ انھیں قصائد وغیرہ کے علاوہ چودہ ہزار نظمیں زبانی یاد تھیں۔

حماسہ ان کی بہترین کتاب ہے جس کی ادبی دنیا میں ایک خاص حیثیت ہے، اگرچہ بعض متعصب دشمنانِ اہلبیتؑ ان کے اشعار کے پڑھنے اور لکھنے سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ ابو تمام کی وفات ۲۳۱ھ میں موصل میں ہوئی ہے اور وہیں ان کا مزار بنا ہوا ہے۔

۴۔ ابو الحسن علی بن مہزیار اہوازی

امام جوادؑ نے انھیں ایک خط میں تحریر فرمایا تھا کہ میں نے نصیحت قبول کرنے، اطاعت کرنے، خدمت و احترام کرنے کے اعتبار سے تمھارا مکمل امتحان لے لیا ہے اور تمھیں فرائض کا مکمل طور پر ادا کرنے والا پایا ہے کہ اگر میں یہ کہہ دوں کہ تم جیسا انسان نہیں دیکھا ہے تو شائد صداقت کے حدود کے اندر ہی رہوں گا۔

ان کے والد اگرچہ عیسائی تھے لیکن انھوں نے اس قدر کمال فقہ و فقاہت میں پیدا کر لیا کہ حضرت جوادؑ کے مخصوص اصحاب میں شامل ہوگئے اور بعض علاقوں میں حضرت کے وکیل بھی رہے، بلکہ آپ کے بعد امام علی نقیؑ کے بھی وکیل رہے۔

ان کے بھائی ابراہیم اور فرزند محمد بن علی کا شمار بھی معتبر اصحاب امام علی نقیؑ میں ہوتا ہے۔

۵۔ ثقۃ الاسلام محمد بن ابی عمیر بغدادی

ان کی وثاقت اور جلالت قدر کو دوست اور دشمن دونوں نے تسلیم کیا ہے اور بعض حضرات نے تو انھیں یونس بن عبدالرحمٰن سے بھی زیادہ افضل قرار دیا ہے جب کہ ان کے بارے میں یہ فقرہ مشہور ہے کہ ملتِ اسلام میں سلمان فارسی اور ان کے بعد یونس بن عبدالرحمٰن سے بڑا فقیہ کوئی نہیں پیدا ہوا ہے۔

مامون رشید کے حکم سے سندی بن شاہک نے انھیں تشیع کے جرم میں ۱۲۰ تازیانے لگائے اور قیدخانہ میں ڈال دیا جس سے ایک لاکھ ۲۱ ہزار درہم دے کر رہائی حاصل کی کہ ابن ابی عمیر صاحب ثروت انسان تھے ورنہ شاید ساری زندگی قیدخانہ ہی میں رہ جاتے۔ حکومت وقت کو اس قدر ٹیکس دینے کے بعد بالکل محتاج ہوگئے اور حکومت نے ان کی ساری املاک کو ضبط کرلیا۔ اتفاق سے ایک شخص نے ان سے دس ہزار درہم قرض لیے تھے، اسے حالات کا علم ہوا تو اپنا مکان فروخت کر کے دس ہزار لے کر آیا۔ ابن ابی عمیر نے پوچھا کہ یہ مال کہاں سے فراہم کیا ہے؟ اس نے کہا کہ اپنا مکان فروخت کردیا ہے۔ فرمایا کہ اسے واپس لے جاؤ، میرے مولا امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ قرض کی خاطر انسان کو اس کے گھر سے نہیں نکالا جاسکتا ہے — اگرچہ اس وقت مجھے ایک ایک درہم کی ضرورت ہے لیکن میں قانون شریعت سے انحراف نہیں کرسکتا ہوں۔

۶۔ محمد بن سنان ابو جعفر الزاہری

امام محمد تقیؑ نے ان کا ذکر خیر فرمایا ہے، اور فرمایا ہے کہ خدا ان سے راضی ہے اس لیے کہ میں ان سے راضی ہوں — انھوں نے نہ میری مخالفت کی ہے — اور نہ میرے پدر بزرگوار کی مخالفت کی ہے۔

اس آخری جملہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں کچھ مخالفت کی خبریں مشہور ہوگئی تھیں جن کی صفائی دینا امام علیہ السلام کی نظر میں ضروری تھا۔

ان کے حالات میں یہ بات بھی نقل کی گئی ہے کہ نابینا ہوگئے تھے تو امام تقی علیہ السلام نے ان کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر انھیں بینا بنا دیا، لہٰذا یہ مرکز اعتماد امام ہونے کے علاوہ مصدر معجزۂ امامؑ بھی تھے، اور اتنی سی بات بھی ان کی عظمت و وثاقت کے لیے کافی ہے۔

۷۔ ایوب بن نوح بن دراج الکوفی

مرد ثقہ اور صاحب کتب تھے۔ امام رضاؑ اور امام جوادؑ کے وکیل بھی تھے۔ انتہائی محتاط اور متقی انسان تھے۔

۸۔ جعفر بن محمد بن یونس الاحول

امام رضاؑ اور امام جوادؑ دونوں کے اصحاب میں تھے اور مرد ثقہ تھے۔

۹۔ حسین بن سعید الاہوازی

امام رضاؑ، امام جوادؑ اور امام ہادیؑ کے اصحاب میں تھے اور تقریباً تیس کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

۱۰۔ علی بن اسباط بن سالم

امام رضاؑ اور امام جوادؑ کے اصحاب میں مرد ثقہ اور صاحب کتاب تفسیر تھے۔ آپ کی صداقت بیان شہرۂ آفاق تھی اور اپنے ساتھیوں کے لیے معلّم کی حیثیت رکھتے تھے۔